© rasailojaraid.com

اسلام برِّعظیم پاک و ہند میں

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

برِّعظیم پاک و ہند میں خورشیدِ اسلام اوّلاً عینِ غرب یعنی مکران اور بلوچستان کے اُفق پر خلافتِ بنی اُمیہ کے زمانے میں اُس وقت طلوع ہوا جب نبی اکرم ﷺ کے انتقال پر اسّی برس [1] بیت چکے تھے اور دورِ خلافتِ راشدہ کو ختم ہوئے بھی نصف صدی کے لگ بھگ عرصہ گزر چکا تھا —— اور اسلام کے صدرِ اول کا جوش و خروش کم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم کے حکم میں داخل ہو چکا تھا۔ چنانچہ سرزمینِ ہند پر 'بابُ الاسلام' سندھ کے راستے اسلام کا یہ ورودِ اوّل بھی کسی مثبت تبلیغی جذبے یا احساسِ فرض کا مرہونِ منت نہ تھا بلکہ ایک وقتی اور فوری اشتعال کا نتیجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس وقت اسلام کی کرنیں موجودہ پاکستان کے بھی صرف نصفِ جنوبی کو منور کر کے رہ گئیں اور اِس مدّ میں بھی جزر کے آثار فوراً ہی شروع ہو گئے اور برِّعظیم پاک و ہند میں اسلام کی یہ آمدِ اوّلین نہایت محدود بھی رہی اور حد درجہ عارضی بھی۔

گویا سرزمینِ ہند دَورِ نبویؐ اور عہدِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی برکات سے تو مطلقاً محروم ہی رہی' جس میں ایمان اور یقین کا کیف و سرور اور جہاد و قتال کا جوش و خروش باہم شیر و شکر تھے اور جہاد کی اصل غرض و غایت فریضۂ شہادت علی الناس کی ادائیگی کا جذبہ تھا یا حصولِ مرتبۂ شہادت [2] کا ذوق و شوق' نہ کہ ملک گیری و کشور کشائی کی ہوس یا مالِ غنیمت و اسبابِ عیش کی حرص۔ مزید محرومی یہ رہی کہ اُسے اُس خالص عربی الاصل اسلام کے اثرات سے متمتع ہونے کا موقع بھی بہت ہی کم ملا جس میں دین و دنیا کی وحدت و یگانگت ابھی اِس حد تک باقی تھی کہ رات کے راہب ہی دن کے شہسوار [3] ہوتے تھے اور ایک ہی انسان کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوتا تھا اور دوسرے میں تلوار!

بعد ازاں جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر تو اسلام کے انوار و برکات کا ترشّح عرب تاجروں کی آمد و رفت کے طفیل تقریباً مسلسل ہوتا رہا' اگرچہ اِس کی نوعیت ایک ہلکی سی پھوار یا دھیمی سی آنچ کی تھی

---

(۱) آنحضور ﷺ کا سنِ وفات ۶۳۲ء ہے اور سندھ پر محمد بن قاسمؒ کا حملہ ۷۱۲ء میں ہوا۔

(۲) بقول علامہ اقبال ؎ شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

(۳) رستم' سپہ سالارِ افواجِ ایران کو اُس کے مخبروں نے مسلمان افواج کے جو حالات بتائے تھے اُن میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ "هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ" یعنی "وہ رات کے راہب ہیں اور دن کے شہسوار!"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس کے اثرات زیادہ محسوس و مشہود نہیں ہوتے —— لیکن شمال مغربی سرحد پر واقع پہاڑی درّوں سے اسلام کا سیلاب کم و بیش تین صدیوں بعد شروع ہوا اور مزید لگ بھگ دو سو برس تک اِس کی نوعیت واقعتاً پہاڑی ندی نالوں کے سیلاب ہی کی سی رہی کہ زور و شور اور غیظ و غضب کے ساتھ آیا اور آناً فاناً گزر گیا —— اور اگرچہ اِس بار موجودہ پاکستان کے نصف شمالی کی قسمت جاگی کہ وہ ۱۰۰۰ء کے آس پاس ہی با قاعدہ اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا' تاہم واقعہ یہی ہے کہ محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں کی اصل حیثیت پہاڑی نالوں کے سیلاب سے زیادہ نہ تھی جو اِدھر آتا ہے اُدھر گزر جاتا ہے!

تختِ دہلی پر مسلمانوں کو با قاعدہ تمکّن ۱۲۰۶ء کے لگ بھگ حاصل ہوا اور ہندوستان میں مسلمانوں کا دورِ حکومت عروج و زوال اور مدّ و جزر کے مختلف مدارج و مراحل سے گزرتا ہوا ۱۸۵۷ء کے 'غدر' پر ختم ہو گیا۔ اِن ساڑھے چھ سو سالوں کے نصفِ اوّل کے دوران' یعنی ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک پہلے کچھ ترکی النسل 'غلام بادشاہ'[۱] تختِ دہلی کو زینت بخشتے رہے اور بعد ازاں کچھ افغان خاندان (خلجی' لودھی وغیرہ) حکمران رہے' اور نصفِ ثانی یعنی ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک مغلوں کا دور ہے جس کے کُل سوا تین سو سالوں میں سے پہلے پونے دو سو برس[۲] اُن کی اصل عظمت و سطوت کا زمانہ ہے اور بعد کے ڈیڑھ سو برس اصلاً ایک عظیم عمارت کے کھنڈروں میں تبدیل ہونے اور بالآخر زمین بوس ہو جانے کا عرصہ! (ع ''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی!'')

گویا ہندوستان میں اسلام آیا ہی اُس وقت جب وہ اپنی نشأۃِ اولیٰ کے بعد زوالِ اوّل سے پوری شدّت کے ساتھ دوچار ہو چکا تھا اور اُس کی وحدتِ فکری بھی پارہ پارہ ہو چکی تھی اور وحدتِ ملی بھی۔ چنانچہ ایک طرف عالمِ اسلام کے قلب میں عرب قوت کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا اور خلافتِ بنی عباس کا دیا چراغِ سحری کے مانند ٹمٹما رہا تھا[۳] اور پوری مملکت طوائف الملوکی کا شکار تھی' گویا بنی اسمٰعیلؑ کے حق میں

---

(۱) تاریخ اسلام کا یہ دور عجیب ہے کہ از شرق تا غرب غلاموں ہی کی حکومتیں قائم تھیں۔ چنانچہ ہند میں خاندانِ غلاماں حکمران تھا تو مصر میں مملوک سریر آرائے مملکت تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کو کہاں سے اٹھا کر کہاں تک پہنچایا!

(۲) یعنی ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات تک!

(۳) چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی با قاعدہ حکومت کے آغاز کے نصف ہی صدی کے اندر اندر یہ چراغ بالکل بجھ گیا اور ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد میں وہ قتل عام ہوا کہ الامان والحفیظ —— اور آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ اس طرح سرِ عام ذبح کر دیا گیا جیسے کسی بھیڑ یا بکری کو حلال کر دیا جائے۔ جس پر خون کے آنسو بہائے شیخ سعدی نے ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں — بر زوالِ مُلکِ مستعصم امیر المؤمنیں!
اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری ز خاک — سر بروں آرد قیامت درمیانِ خلق بیں!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وعیدِ خداوندی ﴿اِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ﴾ پوری طرح ظاہر ہو چکی تھی —— اور دوسری طرف خلافتِ اسلامی کی وہ توحیدی شان ایک داستانِ پارینہ بن چکی تھی جس میں نہ دین و دنیا کے مابین کوئی دوئی تھی نہ مذہب و ریاست میں کوئی جدائی' اور خدا کے جلال و جمال [(۱)] کے مظاہر جدا تھے نہ سلطانی و درویشی کے مصداق مختلف! —— اور اس کی جگہ قیادت و سیادت اور رہنمائی و پیشوائی کے ضمن میں ملوک' احبار اور رُہبان پر مشتمل وہ قدیم تثلیث [(۲)] پوری طرح رائج و نافذ ہو چکی تھی جو ایک اسلام کے سوا دنیا کی تمام تہذیبوں اور تمدنوں کا جزوِ لاینفک رہی ہے اور جس سے پیشگی خبردار کیا تھا عہدِ اوّلین ہی میں حضرت عبداللہ بن المبارکؒ نے اپنے اس حد درجہ فصیح و بلیغ شعر میں [(۳)] ؎

وَمَا اَفۡسَدَ الدِّیۡنَ اِلَّا الۡمُلُوۡکُ
وَاَحۡبَارُ سَوۡءٍ وَرُهۡبَانُهَا

—— اور اگرچہ اسلام کے اعجاز نے اس دورِ زوال و انحطاط میں بھی بہت سی عظیم اور استثنائی (exceptional) شخصیتیں پیدا کیں' جیسے صلاح الدین ایوبیؒ اور ناصر الدین محمودؒ ایسے درویش بادشاہ اور امام ابن تیمیہؒ ایسی جامع سیف و قلم شخصیت' تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس دور تک ایک جانب مسلمان حکمران و سلاطین اکثر و بیشتر ''آیۂ اِنَّ الۡمُلُوۡکَ'' [(۴)] کے مصداق کامل بن چکے تھے اور دوسری جانب علماء و صوفیاء کی عظیم اکثریت بھی آیاتِ قرآنی ﴿لَوۡلَا یَنۡهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِهِمُ الۡاِثۡمَ

---

۱) ؎ شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود — فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب

۲) گویا علامہ اقبال کا یہ شعر کہ ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

ظاہری طور پر بھی مطابقِ واقعہ ہے اور معنوی طور پر بھی۔ خصوصاً تاریخ اسلام کے اس دور میں جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے ایک طرف تثلیث کے فرزندوں نے صلیبی جنگوں سے عالمِ اسلام کا عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا اور دوسری طرف یہ معنوی تثلیث اسلام کی وحدانیت کی جڑیں کھوکھلی کر چکی تھی۔

۳) حضرت عبداللہ بن المبارکؒ کے اس شعر کی اتنی ہی فصیح و بلیغ ترجمانی کی ہے علامہ اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری!

۴) علامہ اقبال مرحوم نے ان الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ الۡمُلُوۡکَ اِذَا دَخَلُوۡا قَرۡیَۃً اَفۡسَدُوۡهَا وَجَعَلُوۡۤا اَعِزَّۃَ اَهۡلِهَاۤ اَذِلَّۃً﴾ (النمل:۳۴) کے حوالے سے کس قدر عمدہ اشعار کہے ہیں:

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الۡمُلُوۡکَ — سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

﴿وَاَكۡلِهِمُ السُّحۡتَ﴾ (المائدۃ:٦٣)اور ﴿اِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَالرُّهۡبَانِ لَيَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ﴾ (التوبۃ: ٣٤) کی مظہرِ اتم بن چکی تھی۔ فَوَاحَسۡرَتَا وَیَااَسَفَا!

ہندوستان میں اسلام وارد تو ایسی منقسم حالت میں ہوا تھا کہ اصحابِ سیف وسناں جدا تھے اور صاحبانِ قرطاس وقلم جدا — اور زیبِ منبر ومحراب اور تھے اور زینتِ میدانِ جنگ وقتال اور — چنانچہ ابتدا میں ایک جانب محمود غزنوی اور محمد غوری کی سرفروشانہ ترکتازیاں تھیں اور دوسری جانب شیخ اسماعیل بخاری اور شیخ علی ہجویری رحمہما اللہ کی تبلیغ وتلقین اور تعلیم وتربیت کی انتھک کوششیں — اور بعد میں ایک طرف قطب الدین ایبک اور بختیار خلجی کی تلواریں مملکت کی توسیع اور استحکام کا فریضہ سرانجام دے رہی تھیں تو دوسری طرف خواجگانِ سلسلۂ چشت رحمہم اللہ نفوس کے تزکیے‘ قلوب کے تصفیے اور سیرت وکردار کی تعمیر میں مصروف تھے۔ تاہم غنیمت ہے کہ آغاز میں اِن دونوں حلقوں کے مابین گہرا ربط وتعلق موجود تھا‘ جس کا عظیم ترین نشان (symbol) ہے سلطان التتمش کی جامع الصفات شخصیت کہ ایک طرف ایک عظیم مملکت کا حکمران بھی تھا اور دوسری طرف خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمہ اللہ کا حلقہ بگوش اور حد درجہ عابد وزاہد انسان بھی — یہاں تک کہ حضرتِ خواجہ کے انتقال پر جب لوگ نمازِ جنازہ کے لیے جمع ہوئے اور وہاں خواجۂ مرحوم کی اِس وصیت کا اعلان کیا گیا کہ میری نمازِ جنازہ صرف وہ شخص پڑھائے جس نے عمر بھر کبھی زنا نہ کیا ہو اور جس کی نہ کبھی تکبیرِ اولیٰ فوت ہوئی ہو نہ عصر کی سنتیں چھوٹی ہوں‘ نتیجتاً مجمع پر سکتہ سا طاری ہو گیا اور تمام لوگ حیران وپریشان ہو کر رہ گئے کہ ایسا شخص کون ہو سکتا ہے جس میں یہ ساری شرطیں پوری موجود ہوں تو قدرے تامل وانتظار کے بعد جو شخص اگلی صف سے امامت کے لیے نکلا وہ خود بادشاہِ وقت سلطان التتمش تھا!

لیکن جلد ہی یہ رابطہ کمزور پڑ گیا اور رجالِ سلطنت اور رجالِ دین کے مابین ایک بُعد اور فصل پیدا ہو گیا اور اُن کے شب وروز ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بالکل متضاد ہو گئے‘ اور جیسے جیسے وقت گزرا یہ خلیج عمیق سے عمیق تر اور وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

مزید برآں‘ ہندوستان میں اسلام علاقۂ ماوراء النہر سے آیا تھا جہاں خود مذہبی حلقوں میں مدرسہ وخانقاہ کی تقسیم راسخ ہو چکی تھی اور اُن کے مابین مسابقت ہی نہیں منافرت کا آغاز ہو چکا تھا اور جہاں مدارس میں حنفی فقہ‘ اشعری وماتریدی عقائد‘ یونانی فلسفہ ومنطق اور اِن سب کے معجونِ مرکب علمِ کلام کا دور دورہ تھا‘ اور خانقاہوں میں وحدت الوجود کا سکہ رواں تھا۔ لہٰذا اسلامی ہند میں مذہب کی عمارت اِن ہی دو ستونوں پر استوار ہوئی‘ یعنی ایک شدید حنفیت اور دوسرے وجودی تصوف۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن حکیم یہاں ابتدا ہی سے صرف ایک 'کتابِ مقدس' کی حیثیت سے متعارف ہوا اور علمِ حدیث سے یہ سرزمین دیر تک نابلدِ محض رہی' اور چونکہ عربی یہاں صرف اعلیٰ علمی حلقوں تک محدود رہی اور عام بول چال' تصنیف و تالیف' شعروادب اور سرکار دربار سب پر فارسی کا قبضہ رہا لہٰذا قرآن و حدیث سے یہ بعد اور دُوری نہ صرف یہ کہ قائم رہی بلکہ مرورِ ایام کے ساتھ مزید بڑھتی چلی گئی۔

اِس غُلُوّ فی الحنفیت اور بُعد عن حدیثِ الرسولؐ کے ضمن میں ایک نہایت دلچسپ لیکن ساتھ ہی حد درجہ عبرت انگیز واقعہ نقل ہوا ہے کہ جب سلطان غیاث الدین تغلق کے دربار میں ایک خاص مسئلے پر شیخ الوقت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور شیخ الاسلام قاضی جلال الدین کے مابین مناظرہ ہوا اور اپنے موقف کے حق میں بطورِ دلیل پیش کرنا چاہا خواجہ نظام الدین نے ایک حدیثِ رسولؐ کو' تو بلا کسی جھجک اور تامل کے بھرے دربار میں ڈنکے کی چوٹ کہا شیخ الاسلام نے کہ:

''تو مقلّدِ ابو حنیفه هستی' تُرابا حدیثِ رسولؐ چه کار؟ قولِ ابی حنیفه بیار!''

''تم مقلد ابوحنیفہ ہو' یعنی حنفی ہو' تمہیں حدیثِ رسولؐ سے کیا سروکار؟ اگر امام ابوحنیفہ کا کوئی قول پیش کر سکتے ہو تو کرو!''

جس پر حضرتِ خواجہ نے یہ کہتے ہوئے مناظرہ ختم کر دیا اور دربار سے اٹھ گئے کہ:

''سبحان الله! كه باوجود قولِ مصطفویؐ از من قولِ ابی حنیفهؒ می خواهند!''

(سیر العارفین)

''سبحان اللہ! نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے ہوتے ہوئے مجھ سے امام ابوحنیفہؒ کے قول کا مطالبہ کیا جا رہا ہے!''

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلامی ہند میں آغاز ہی سے دو حکومتیں قائم ہو گئی تھیں' ایک ظاہری حکومت جس کا اقتدار یا زمین پر قائم تھا یا انسانوں کے جسموں پر — اور دوسری باطنی حکومت جس کا سکہ قلوب کی دنیا میں رواں تھا۔ پہلی حکومت اصلاً ملوک و سلاطین اور امراء و عمایدِ سلطنت کی تھی اور اُن کے ساتھ بطورِ تتمہ یا ضمیمہ منسلک تھے ائمہ و خطباء' مدرّسین و معلّمین اور مفتی و قاضی حضرات' اور اس دنیا میں جیسے کہ عرض کیا گیا فقہ ہی کو گویا کل دین کی حیثیت حاصل تھی! جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ متشدّدانہ ظاہر پرستی اور قانونی موشگافی کا دور دورہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ دین و مذہب نے بالکل خشک قانونیت کی شکل اختیار کر لی۔

دوسری طرف' تصوف کے خانوادوں میں سے ارضِ ہند پر سب سے پہلے چشتی سلسلے نے قدم جمائے اور کم و بیش دو صدیوں تک خواجگانِ چشت ہی کا طوطی بولتا رہا۔ جیسے ہی اِس سلسلے میں قدرے ضعف کے آثار پیدا ہوئے وسطی اور جنوبی ہند میں سہروردیہ اور شطاریہ سلسلوں کو فروغ حاصل ہوا اور شمال مغرب میں خصوصاً موجودہ پاکستان کے وسطی علاقوں میں قادریہ سلسلے نے عروج پایا۔ ان تمام سلاسل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں وحدت الوجود کو گویا اصولِ موضوعہ کی حیثیت حاصل تھی اور اِس کے زیرِ اثر کیف وسرور‘ جذب ومستی اور وجد ورقص کا ذوق وشوق بڑھ رہا تھا اور فنا فی اللہ کو شغل وسلوک کے منتہائے مقصود کی حیثیت حاصل ہو رہی تھی جس کے باعث قویٰ مضمحل ہو رہے تھے اور جذبۂ جہاد تو دور رہا جذبۂ عمل بھی سرد پڑتا جا رہا تھا!

مزید برآں — باطنی احوال وکوائف پر توجہ کے ارتکاز کے باعث ظاہر کی اہمیت کم ہوتی جا رہی تھی‘ طریقت کے عروج کے ساتھ ساتھ شریعت کا استخفاف ہونے لگا تھا‘ عشق ومحبت کی سرمستی میں پابندیٔ شریعت اور اتباعِ سُنّت پر پھبتیاں کسی جانے لگی تھیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہمہ اوستی نظریات کے باعث وسیع المشربی اتنی بڑھتی جا رہی تھی کہ رام اور رحمٰن ایک نظر آنے لگے تھے‘ مسجد ومندر اور دیر وکلیسا میں کوئی فرق نہ رہا تھا‘ اور ع ”با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام“ پر عمل عام ہو گیا تھا۔ نتیجتاً ملّتِ اسلامی کا جداگانہ تشخص ہی شدید خطرات سے دوچار ہو گیا تھا۔

علمائے ظاہر یا ”حاملانِ دین اور حامیانِ شرعِ متین“ کی جانب سے اِس طرزِ عمل کی مخالفت ایک فطری امر تھا‘ لیکن اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدرسہ وخانقاہ کی باہمی چشمک رفتہ رفتہ بُغض اور عداوت میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اسلامی ہند کی پوری تاریخ رجالِ سلطنت اور رجالِ دین کی باہمی کشمکش اور علماء اور صوفیاء کی باہمی آویزش کی مسلسل داستان ہے‘ جس میں ایک ’بُعدِ رابع‘ (fourth-dimension) کا اضافہ ہو گیا اوائل عہدِ مغلیہ میں ایران سے شیعیت کی درآمد سے‘ جس نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا اور اِس کے زیرِ اثر مشرکانہ عقائد وخیالات اور بدعات ورسومات کا ایک سیلاب ارضِ ہند پر آ گیا!

مسلم انڈیا کا سنہرا دور بلاشبہ اُس کا صدرِ اوّل ہی تھا‘ یعنی دورِ خاندانِ غلاماں‘ جس میں ملوک‘ احبار‘ رہبان کی تثلیث اگرچہ اصولاً تو موجود تھی تاہم ابھی اِس میں نہ تنزل وانحطاط کے آثار نمایاں ہوئے تھے نہ باہمی بُغض وعناد کے‘ بلکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے نہ صرف یہ کہ باہمی توافق وتعاون موجود تھا بلکہ بعض مثالیں انتہائی حسین امتزاج کی بھی نظر آ جاتی ہیں — لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرا‘ زوال اور پستی کے جانب قدم بڑھتے گئے‘ اور نہ صرف یہ کہ متذکرہ بالا تثلیث کا گھناؤنا پن بڑھتا چلا گیا‘ بلکہ اُس کی جڑیں بھی مسلم سوسائٹی میں مزید گہری اترتی چلی گئیں — تا آنکہ مغلِ اعظم شہنشاہِ اکبر کے زمانے میں یہ صورتِ حال اپنے نقطۂ عروج (climax) کو پہنچ گئی‘ اور حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ عین اُس وقت جب کہ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کا خورشیدِ حکومت نصف النہار پر چمک رہا تھا‘ اسلام پر انتہائی غربت اور شدید بے کسی وکسمپرسی کی حالت طاری ہو گئی! یہاں تک کہ نام نہاد ’دینِ الٰہی‘ نے دینِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی کامل بیخ کنی کرنے یا کم از کم اُسے سرزمینِ ہند سے ملک بدر کر دینے کا بیڑا اٹھالیا! یہ دوسری بات ہے کہ فطرت کے اِس اٹل قانون کے مطابق کہ جزر جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اُسی کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوکھ سے مد کے آثار جنم لیتے ہیں۔ ہندوستان میں اسلام کے زوال کی انتہا کا یہ دور سرزمینِ پاک و ہند میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی تمہید بن گیا! بقول علامہ اقبال ؎

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں   توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری

سولہویں صدی عیسوی کے وسط کے لگ بھگ جب مغلِ اعظم علیہ ما علیہ کے آفتابِ اقتدار نے ابتدائی موانع ومشکلات کی بدلیوں سے نکل کر پوری آب وتاب کے ساتھ چمکنا شروع ہی کیا تھا اور ہندوستان میں اسلام کے انتہائی زوال وانحطاط کے دورِ سیاہ کا آغاز ہونے ہی والا تھا' اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کے تحت سرزمینِ ہند میں دو خورشیدِ ہدایت بھی طلوع ہوئے: ایک مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (جن کی ولادت ۱۵۶۴ء میں ہوئی) اور دوسرے: حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (جن کا سنِ ولادت ۱۵۵۱ء ہے) جن کی مصلحانہ ومجدّدانہ مساعی نے حالات کے دھارے کا رخ اِس حد تک موڑ کر رکھ دیا کہ تقریباً چار سو سال کے بعد اسلامی ہند کو غازی اورنگزیب عالمگیرؒ کی ذات میں گویا غازی صلاح الدین ایوبیؒ اور سلطان ناصر الدین محمودؒ کے محاسن کا جامع حکمران نصیب ہوا اور اِس طرح مسلم انڈیا کے اوّل وآخر کے مابین ایک مشابہت اور مماثلت پیدا ہوگئی!

اِن میں سے مقدم الذکر یعنی شیخ مجدد کی مساعی میں پُر جوش مجدّدانہ رنگ نمایاں تھا اور مؤخر الذکر یعنی شیخ محدث کی کوششوں پر خاموش مصلحانہ انداز غالب تھا۔ چنانچہ حالات کے رخ کی فوری تبدیلی میں اصل دخل یقیناً حضرتِ مجدد کی مساعی کو حاصل ہے جب کہ سرزمینِ ہند میں علمِ حدیثِ نبویؐ کا پودا لگانے کی جو خدمت حضرتِ محدث نے سرانجام دی اِس کے اثرات بہت دیرپا اور دوررس ثابت ہوئے۔

حضرتِ مجددؒ کی تجدیدی مساعی کا اصل رخ تصحیحِ عقائد' ردِّ بدعات' التزامِ شریعت اور اتباعِ سنّت کی جانب تھا —— اور اِس ضمن میں اُنہوں نے رائج الوقت علمی ونظری اور اخلاقی وعملی ہر نوع کی گمراہیوں اور ضلالتوں پر بھرپور تنقید کی۔ چنانچہ تردیدِ شیعیت پر بھی نہ صرف یہ کہ اُن کے مکاتیب میں بہت زور ہے بلکہ ''ردِّ روافض'' کے عنوان سے ایک مستقل رسالہ بھی اُنہوں نے تحریر فرمایا—— اور اگرچہ اُن کی اِن اساسی کوششوں سے بھی 'طریقت' اور 'شریعت' کے بُعد کو کم کرنے اور اِس بڑھتی ہوئی خلیج کے پاٹنے میں بہت مدد ملی' تاہم اِس میدان میں اُن کا اصل کارنامہ فلسفۂ وحدت الوجود کے مقابلے میں نظریۂ وحدت الشہود کی تدوین وترویج ہے' جس نے اِن تمام مفاسد کا سدباب کر دیا جو تصوّف کی راہ سے حملہ آور ہو رہے تھے۔ نتیجتاً باطن کے ساتھ ساتھ ظاہر کی اہمیت بھی دوبارہ مسلّم ہوئی' عشق ومحبت کے ساتھ ساتھ اطاعت واتباع کا جذبہ بھی از سرِ نو بیدار ہوا' فنا فی اللہ کے بجائے بقا باللہ کو مقصود ومطلوب کا درجہ حاصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوا‘ جذب و سکر اور مستی و بے خودی کے بجائے جذبہ عمل اور جوشِ جہاد نمایاں ہوئے —— اور اِن سب کا حاصل یہ کہ ہند میں ملّتِ اسلامیہ کا جداگانہ تشخص از سرِنو مستحکم ہو گیا۔ اور یہ خطرہ ٹل گیا کہ کہیں سرزمینِ ہند میں‘ جسے مذہبوں اور فلسفوں کے بہت بڑے عجائب گھر کی حیثیت حاصل ہے‘ دینِ محمدیؐ بھی صرف ماضی کی ایک یادگار بن کر نہ رہ جائے‘ بقول علامہ اقبالؔ مرحوم:

حاضر ہوا میں شیخ مجددؒ کی لحد پر — وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے — جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں‘
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار!

سلسلۂ نقشبندیہ‘ جس کا پودا سرزمین ہند میں حضرتِ مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے مرشد خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ سے لگا‘ اصلاً بھی جملہ سلاسلِ طریقت میں سے اُقرب اِلی الشریعت ہے‘ اور حضرتِ مجددؒ کے ہاتھوں جو عظیم الشان کارنامہ سرانجام پایا اُس کی بنیاد بھی خواجہ باقیؒ باللہ کے ہاتھوں پڑ چکی تھی‘ تاہم واقعہ یہ ہے کہ اِس میں جو شان حضرتِ مجددؒ نے پیدا کی وہ اُنہی کا حصہ ہے —— اور یوں تو بعد میں سلسلۂ نقشبندیہ باقویہ بھی ہندوستان میں جاری رہا اور اُس سے بہت سا خیر پھیلا‘ لیکن ”ہند میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی“ کا فریضہ جس شان کے ساتھ حضرت مجددؒ کے اَحفاد و خلفاء نے ادا کیا اُس میں کوئی دوسرا اُن کے ساتھ شریک نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ یہی وہ واحد سلسلہ ہے جس کے منسلکین نے ذکر و شغل اور مجاہدہ و ریاضت کے علاوہ کلمہ حق کہنے کی پاداش اور ردِّ بدعت و رفض کے جرم کی سزا کے طور پر حوالۂ زنداں ہونے اور جان پر کھیل جانے کی روایات کو بھی از سرِنو تازہ کیا۔ گویا ع ”من از سرِنو جلوہ دہم دار و رسن را!“ (سرمدؔ)

بایں ہمہ‘ حضرتِ مجددؒ کے یہاں بھی حنفیت میں غلو اُسی شدت کے ساتھ موجود ہے جو مسلم انڈیا کی پوری تاریخ کا جزوِ لاینفک ہے۔ گویا حضرتِ مجددؒ کی مساعی سے اسلام ہند میں اُس مقام تک تو پہنچ گیا جہاں سے (دورِ غلاماں میں) اُس کا آغاز ہوا تھا لیکن ع ”دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو!“ کا عمل اِس سے آگے نہ بڑھ سکا۔

البتہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی خدمات کو اِس سمت میں ایک مزید قدم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ شیخ محدثؒ کی شخصیت بعض پہلوؤں سے تو حضرتِ مجددؒ ہی کی شخصیت کا ظلّ معلوم ہوتی ہے‘ لیکن بعض دوسرے اعتبارات سے اُن کی حیثیت تقریباً ایک ڈیڑھ صدی بعد طلوع ہونے والے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آفتابِ رُشد وہدایت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پیشرو یا مقدمۃ الجیش کی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ صوفی بھی تھے اور خواجہ باقی باللہؒ ہی کے مرید بھی، لیکن اِس کے باوجود کہ اُنہیں بھی وحدتُ الوجود سے بعد تھا وہ اُس کی تردید میں اِس درجہ سرگرم نظر نہیں آتے۔ اِسی طرح وہ حنفی بھی تھے لیکن متشدد نہیں بلکہ فقہ حنفی کا رشتہ حدیثِ رسولؐ کے ساتھ جوڑنے کی سعی اولاً اُنہی سے شروع ہوئی۔ اِن دونوں پہلوؤں سے تو وہ شیخِ مجددؒ اور امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بین بین نظر آتے ہیں، لیکن اِس اعتبار سے کہ امام الہندؒ نے اسلام کا رشتہ اُس کی 'اصلِ ثابت' یعنی قرآن حکیم کے ساتھ ازسرِنو قائم کرنے کی کوشش کا آغاز کیا اور شیخ محدثؒ نے دین کا تعلق اُس 'اصلِ ثابت' کی 'فرعِ اوّل' کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کی، اُن کی شخصیت حضرت امام الہندؒ کی شخصیت کا مقدمہ یا دیباچہ نظر آتی ہے —— اور واقعہ یہ ہے کہ یہی حضرتِ محدث کی اصل خدمت (contribution) ہے کہ اُنہوں نے علمِ حدیث کا پودا سرزمینِ ہند میں لگایا اور حدیثِ رسولؐ کی باقاعدہ درس وتدریس کا بھی آغاز کیا اور اِس سے متعلق تصنیف وتالیف کا بھی! چنانچہ خود اُنہوں نے مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اُن کے صاحبزادے شیخ الاسلام نور الحقؒ نے صحیح بخاری کو فارسی میں منتقل کیا۔ مزید برآں اُنہوں نے مشکوٰۃ کی ایک مفصّل شرح (لمعات التنقیح) عربی زبان میں اور اِس سے بھی زیادہ طویل شرح (اَشِعَّۃُ اللَّمْعَات) فارسی میں تحریر کی، علاوہ ازیں اسنادِ حدیث اور اسماء الرجال پر بھی ایک کتاب تصنیف کی اور ''لمعات'' کے مقدمے کے ذریعے بھی علومِ حدیث کا ایک جامع تعارف کرادیا!

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تجدیدی مساعی کا تفصیلی جائزہ تو ظاہر ہے کہ اِن مختصر شذرات کی حدود سے باہر ہے، تاہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ دورِ صحابہؓ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں اُن کی سی جامعیتِ کبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی، اور اِس میں ہرگز کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ واقعتہً دورِ جدید کے فاتح ہیں، اور اِس اعتبار سے خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ اُنہوں نے حضرتِ مجددؒ اور شیخ محدثؒ دونوں کی مساعی کو منطقی انتہا تک پہنچایا خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ وہ دونوں اصلاً امام الہندؒ ہی کی شخصیت کی تمہید تھے، کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک طرف حضرت مجدّدؒ نے ہند میں اُمّتِ مسلمہ کو ازسرِنو ایک مستحکم داخلی تشخّص عطا کیا تو شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دے کر امت کے خلاف اٹھنے والے سب سے بڑے خارجی طوفان کے مقابلے کا سامان کیا۔ حضرتِ مجدّدؒ نے 'ردِ روافض' سے جس کام کا آغاز فرمایا تھا اِس کی تکمیل شاہ صاحبؒ نے ''ازالۃُ الخِفاء عن خلافۃ الخلفاء'' اور ''قُرّۃ العینین فی تفضیل الشیخینؓ'' اور ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ نے ’’تحفہ اثنا عشریہ‘‘ ایسی کتابوں کی تصنیف سے کی۔ دوسری طرف شیخ محدثؒ نے علمِ حدیث کا جو پودا سرزمین ہند میں لگایا تھا شاہ صاحب اور اُن کے خلفاء نے نہ صرف یہ کہ اُس کی آبیاری کی بلکہ اپنی انتھک کوششوں سے صنم خانۂ ہند کو علمِ حدیثِ نبویؐ کا ایک عظیم الشان چمن بنا دیا۔ عجیب مشابہت ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے مشکوٰۃ المصابیح کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی اور ایک فارسی میں۔ اِسی طرح امام الہندؒ نے مؤطا امام مالکؒ کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی (المُسوّٰی) اور ایک فارسی میں لکھی (المُصفّٰی)۔ واضح رہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک مؤطا امام مالکؒ کو علم حدیث کے ذیل میں اصلِ اوّل کی حیثیت حاصل ہے۔

اِن پر مستزاد ہیں شاہ صاحبؒ کے وہ کارنامے جن کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے طویل عمل کا اصل نقطۂ آغاز اُن ہی کی ذاتِ گرامی ہے:

مثلاً ایک یہ کہ علم فقہ کے میدان میں ایک طرف آپؒ نے ’’**عقد الجید فی احکام الاجتهاد والتقلید**‘‘ تصنیف فرمائی جس سے تقلید جامد اور اجتہادِ مطلق کے مابین اعتدال کی راہ واضح ہوئی اور دوسری طرف ’’**الانصاف فی بیان سبب الاختلاف**‘‘ ایسی معرکۃ الآراء کتاب لکھی جس نے فقہی اختلافات کی اہمیت کو کم کرنے کے ضمن میں نہایت دوررس نتائج پیدا کیے۔

دوسرے یہ کہ اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف ’’**حُجة الله البالغه**‘‘ کے ذریعے آپ نے حکمتِ دین کو ایک باقاعدہ علم کی حیثیت دے دی اور اسلام کے نظامِ عقائد، نظامِ عبادات اور نظامِ معاشرت و معاملات کو ایک مربوط اور منضبط نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا جس کی آنے والے دور میں شدید ترین ضرورت پیش آنے والی تھی —— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اسلام کا رشتہ اُس کی اصلِ ثابت یعنی قرآن حکیم کے ساتھ ازسرِنو قائم کرنے کے طویل عمل کا باقاعدہ آغاز فرما دیا۔ چنانچہ ایک طرف قرآنِ مجید کے فارسی ترجمے کے ذریعے قرآن کے مطالب و مفاہیم کو عوام تک پہنچانے کا اہتمام کیا —— اگرچہ اِس پر اُنہیں شدید مخالفت حتیٰ کہ عوامی یورش تک کا سامنا کرنا پڑا —— اور دوسری طرف ’’**الفوز الکبیر فی اصول التفسیر**‘‘ کی تصنیف کے ذریعے علمِ تفسیر کو ایک چیستاں کے بجائے ایک باقاعدہ فن کی حیثیت سے متعارف کرایا اور درمیانی استعداد تک کے حامل لوگوں کے لیے فہمِ قرآن کی راہیں آسان کر دیں۔

شاہ صاحبؒ کے جلیل القدر فرزندوں میں سے دو یعنی شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن مجید کے بامحاورہ اور لفظی ترجمے کر کے گویا اپنے والدِ مرحوم کے شروع کیے ہوئے کام کو منطقی انتہا تک پہنچا دیا — اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج برعظیم پاک و ہند میں علم و فہم قرآن کا جو غلغلہ اور ہمہمہ ہے وہ سب دہلی کے اِسی عظیم خانوادے کی مساعی کا نتیجہ نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الغرض ویسے تو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کا علمی اصلاح وتجدید کا پورا کارنامہ ہی نہایت رفیع اور قابلِ قدر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اُن کی مساعی کو عالم اسلام میں یورپ کی پوری تحریکِ احیاء العلوم (Renaissance) کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن ان کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے توجہات کو از سرِ نو قرآنِ حکیم کے علم وحکمت کی جانب منعطف کر دیا اور اللہ کی رسی کے ساتھ اُمتِ مُسلمہ کے تعلق کو دوبارہ استوار کرنے کی سعی کا آغاز کر کے گویا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اِس قول کے مطابق کہ "لَا يُصْلَحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا" اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی سعی وجُہد کی راہ کھول دی۔ فجزاہُ اللّٰہ احسن الجزاء!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی قرآنی خدمات پر جو جامع تبصرہ شیخ محمد اکرام مرحوم نے اپنی تالیف 'رودِ کوثر' میں کیا ہے وہ ہدیۂ قارئین کر دیا جائے۔ وَھُوَ ھٰذا:

''آپ کا سب سے اہم کام قرآن اور علومِ قرآنی کی اشاعت ہے اور اِس سلسلے میں آپ کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بہت کم لوگ عربی جانتے تھے۔ دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی، لیکن اِس زبان میں قرآنِ مجید کا کوئی ترجمہ رائج نہ تھا(۱)۔ چنانچہ عام تعلیم یافتہ مسلمان گلستان' بوستان' سکندر نامہ اور شاہنامہ تو پڑھتے اور سمجھتے' لیکن قرآنِ مجید سے' جو ہدایات کا سرچشمہ ہے' ناواقف رہتے۔ پرانے علماء اور خواص میں سے قرآنِ مجید اگر کسی نے پڑھا تو ناظرانہ یعنی مفہوم ومعانی سمجھنے اور اُس کی روح وتعلیمات سے فیضیاب ہونے کے بغیر۔ اکبر کے دربار میں جب مسلمان علماء اور پرتگیز مشنریوں میں مباحثے ہوئے اور مشنریوں نے (جو کلام مجید کے لاطینی ترجمے کی وجہ سے اس کے اندراجات سے خوب واقف تھے) کلامِ مجید کے بعض حصوں پر اعتراض کیے تو اُس وقت پتا چلا کہ جن مسلمانوں نے عربی میں قرآن پڑھا بھی تھا اُنہیں بھی اس کے مضامین اور اندراجات سے پوری طرح واقفیت نہ تھی۔ بسا اوقات یہ ہوتا کہ پادری کلامِ مجید کے کسی بیان پر اعتراض کرتے اور مسلمان کہہ دیتے کہ یہ تو قرآن میں ہے ہی نہیں اور پھر جب کلامِ مجید کھول کے دیکھا جاتا تو وہ حوالے نکلتے۔ شاہ صاحب کو اِس بوالعجبی کا احساس ہوا اور حج سے واپس آنے کے پانچ سال بعد ۳۸۔۱۷۳۷ء میں آپ نے فارسی زبان میں کلامِ مجید کا ترجمہ کیا۔ جب علماء کو اِس کا پتا چلا تو تلواریں کھینچ کر آ گئے کہ یہ کلامِ مجید کی انتہائی بے ادبی ہے۔ بعض

---

(۱) شیخ سعدیؒ کا ایک ترجمہ اب بھی بازار میں ملتا ہے' لیکن شیخ سعدیؒ سے اس کی نسبت مشتبہ ہے اور یقیناً یہ ترجمہ کبھی بھی رائج نہیں ہوا۔ شاہ صاحب سے پہلے مَلِکُ العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے سلاطین جونپور کے زمانے میں ایک تفسیر بحرِ مواج لکھی تھی' جس میں ہر آیت کی تشریح وتفسیر سے پہلے اُس کا ترجمہ دیا تھا' لیکن ظاہر ہے اِس ترجمے کی حیثیت محض ضمنی اور جزوی تھی اور اُسے کبھی بھی عام مقبولیت نصیب نہ ہوئی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اِس مخالفت کی وجہ سے شاہ صاحب کی جان اِس طرح خطرے میں پڑ گئی کہ اُنہیں کچھ عرصہ کے لیے دہلی سے چلے جانا پڑا۔ لیکن بالآخر شاہ صاحب کی جرأت اور فرض شناسی کامیاب ہوئی۔ اُنہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ اِس لیے نہیں آیا کہ اِسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر طاق پر تبرکاً رکھا جائے یا جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھا کرتی ہیں' ہم اِسے طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھ دیں۔ یہ کتاب انسانی زندگی کے متعلق اہم ترین حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ اِس کے نازل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اِسے پڑھیں' اِن حقائق کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں اور اِس کے لیے رائج الوقت زبانوں میں اِس کا ترجمہ ضروری ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ معترضین کی مخالفت کم ہوئی اور نہ صرف شاہ صاحب کے ترجمے نے رواج پایا' بلکہ اردو اور دوسری زبانوں کے ترجموں کی راہ پیدا ہوگئی۔

قرآنِ مجید کا محض ترجمہ کر دینا ہی اِس قدر اہم کام تھا کہ اگر شاہ صاحب فقط اِسی کارِ خیر پر اکتفا کرتے اور وہ ابتدائی دشواریاں دور کر دیتے جو عام علماء کی فرض ناشناسی اور کورانہ تقلید کی وجہ سے اُن کے راستے میں حائل تھیں' تب بھی اسلامی تاریخ میں اُن کا نام درخشاں ستارے کی طرح چمکتا' لیکن اُن کا ترجمہ بطورِ خود بلند پایہ اور قابل قدر و عظمت ہے۔ ترجمے کی مخالفت بیشتر تو تقلید اور امورِ مذہب میں مغز کو چھوڑ کر اُستخوان کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے تھی' لیکن اِس میں شک نہیں کہ قرآنِ مجید کے ترجمے میں ہزاروں دقتیں ہیں۔ ترجمے میں لفظی صحت کو برقرار رکھنا اور اِس کے ساتھ ساتھ قرآن کے بلیغ معانی اور اُس کی ادبی شان کو اِس پر قربان نہ ہونے دینا اِس قدر مشکل ہے کہ آج' جب کہ ہمیں قرآنِ مجید کے ترجموں میں دو سو سال کی مشق ہے اور قوم کے بہترین علماء واُدباء نے اِس قومی خدمت پر توجہ کی ہے' ایک بھی ترجمہ ایسا نہیں' جسے تسلی بخش کہا جا سکے یا جس سے اصل کے زورِ بیان' فصاحت و بلاغت اور روحانی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ شاہ ولی اللہؒ کے ترجمے کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا اور اصل میں ضرورت یہ ہے کہ مستند اور بلند پایہ ترجمے کے لیے علماء اور اہلِ قلم کی ایک پوری جماعت یہ فرض ادا کرے' لیکن اکثر باتوں میں وہ موجودہ اردو ترجموں سے کہیں بہتر ہے اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ قرآنِ مجید کا ترجمہ کرنے والے میں جن خصوصیتوں کی ضرورت ہے' وہ شاہ صاحب سے بڑھ کر آج تک کسی مترجم میں جمع نہیں ہوئیں۔ مولانا نذیر احمد کہتے ہیں: ''فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لیے جتنی باتیں درکار تھیں' ترجمے سے ثابت ہوتا ہے وہ سب مولانا شاہ ولی اللہؒ میں علیٰ وجہِ الکمال پائی جاتی تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا صاحبؒ کی نظر تفاسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس اُنہیں کا حصّہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسّرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب اُن کے پیشِ نظر ہیں اور وہ اُن میں جس کو واضح پاتے ہیں اُسے اختیار کرتے ہیں۔''

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ صاحبؒ نے نہ صرف قرآن مجید کا ترجمہ کیا' بلکہ اِس مسئلے کے علمی پہلوؤں پر بھی ایک رسالہ لکھا اور مقدمہ فی ترجمۃ القرآن المجید میں قرآن مجید کے مترجموں کی رہنمائی کے لیے کار آمد ہدایتیں درج کیں۔

شاہ صاحبؒ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: ''اِس بندۂ ضعیف پر خداوند تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں' جن میں سب سے زیادہ عظیم الشان نعمت یہ ہے کہ اُس نے مجھے قرآن مجید سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی اور حضرت رسالت مآب ﷺ کے احسانات اِس کمترین اُمت پر بہت ہیں' جن میں سب سے بڑا احسان قرآنِ مجید کی تبلیغ ہے۔''

قرآنِ مجید کی تبلیغ شاہ صاحبؒ نے فقط ترجمہ کر کے ہی نہیں کی' بلکہ علم تفسیر کے متعلق کتابیں بھی لکھیں' جن میں ''الفوز الکبیر فی اُصُول التفسیر'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اِس کتاب کے چار باب ہیں' جن میں علومِ قرآنی اور مطالعۂ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے۔ دوسرے باب میں آپ نے مسئلہ نسخ پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالی ہے اور وہ آیاتِ منسوخہ جن کی تعداد بعض لوگوں کے نزدیک پانچ سو کے قریب تھی اور جن کی تعداد علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بھی بیس مقرر کی تھی' چار سے زیادہ تسلیم نہیں کیں۔

الفوز الکبیر کے بعض اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ شاہ صاحب قرآنی ارشادات کو وسیع سے وسیع مفہوم دینا چاہتے تھے۔ وہ مختلف آیتوں اور سورتوں کے متعلق اسبابِ نزول کا خیال رکھتے ہیں' لیکن اِس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ اِس سے کلامِ مجید کے اصلی مقصد پر پردہ نہ پڑ جائے۔ چنانچہ باب اوّل میں لکھتے ہیں: (ترجمہ)

> ''عام مفسّرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی' ایک قصے کے ساتھ ربط دیا ہے اور اس قصّے کو اِس آیت کے لیے سبب نزول مانا ہے' لیکن حق یہ ہے کہ نزولِ قرآنی سے مقصودِ اصلی نفوسِ بشریہ کی تہذیب اور اُن کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی تردید ہے۔ اِس لیے آیاتِ مناظرہ کے نزول کے لیے متکلمین میں عقائد باطلہ کا وجود اور آیاتِ احکام کے لیے اُن میں اعمالِ فاسدہ اور مظالم کا شیوع اور آیاتِ تذکیر کے نزول کے لیے اُن کا بغیر ذکر آلاء اللہ وایام اللہ اور موت وواقعات بعد الموت کے بیدار نہ ہونا' اصلی سبب ہوا۔ خاص واقعات کو جن کے بیان کرنے کی زحمت اٹھائی گئی ہے' اسبابِ نزول میں چنداں دخل نہیں۔ مگر سوائے چند آیات کے جن میں کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یا اِس سے پیشتر واقع ہوا ہو۔''

الفوز الکبیر کی دوسری خصوصیات شاہ صاحب کی انصاف پسندی اور اخلاقی جرأت ہے۔ مثلاً عام طور پر مسلمان زمانۂ جاہلیت کے عربوں سے فقط برائیاں اور عیب ہی منسوب کرتے ہیں' لیکن شاہ صاحب نے اِس معاملے میں بھی ''انصاف بالائے طاعت'' کے اصول کو ملحوظ رکھا اور تصویر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے دونوں پہلو پیش کیے۔ اِسی طرح عام مسلمانوں کا خیال ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی اصل مذہبی کتاب کو بدل ڈالا ہے' لیکن شاہ ولی اللہؒ اِس کے قائل نہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں: ''یہودی تحریفِ لفظی' تورات کے ترجمے وغیرہ میں کیا کرتے تھے نہ کہ اصل کتاب میں' کیونکہ فقیر کے نزدیک ایسا ہی محقق ہوا ہے اور ابنِ عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔''

بعض مفسرین نے اہلِ کتاب سے قصے لے کر اُنہیں قرآنی تفاسیر اور علوم اسلامی کا جزو بنا دیا ہے۔ اِس کے خلاف شاہ صاحب نے جابجا آواز بلند کی ہے۔ مثلاً الفوز الکبیر میں لکھا ہے: ''یہاں پر یہ جان لینا مناسب ہے کہ حضرات انبیاءِ سابقین کے قصے احادیث میں کم مذکور ہیں اور اُن کے وہ لمبے چوڑے تذکرے جن کے بیان کرنے کی تکلیف عام مفسرین کرتے ہیں' وہ سب اِلا ماشاء اللہ علماءِ اہل کتاب سے منقول ہیں''۔ اِسی کتاب میں آگے چل کر پھر لکھتے ہیں: ''اسرائیلی روایات کا نقل کرنا ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے دین میں داخل ہوگئی ہے۔ حالانکہ صحیح اصول یہ ہے کہ اُن کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب''۔ مفسرین کے بعض قصے جنہیں عوام اسلام کا ضروری جزو سمجھنے لگ گئے ہیں' شاہ صاحب کو بہت ناپسند تھے۔ فرماتے تھے: ''اور محمد بن اسحاق واقدی کلبی نے قصہ آفرینی میں جس قدر افراط کی ہے (یعنی وہ ہر ایک آیت کے تحت میں ایک قصہ لائے ہیں) محدثین کے نزدیک اُن کا اکثر حصہ صحیح نہیں اور اُن کے اسناد میں خامیاں ہیں۔ اِن لوگوں کی اِس افراط کو علمِ تفسیر کے لیے شرط سمجھنا صریح غلطی اور اِس کے حفظ پر فہم کتابُ اللہ کو موقوف کرنا دراصل کتابُ اللہ سے اپنا حصّہ کھونا ہے۔''

مفسرین کی یہی ژولیدہ نویسی تھی جس کی وجہ سے شاہ صاحب نے اپنے وصیت نامے میں بھی لکھا کہ قرآن اور اِس کا ترجمہ تفسیر کے بغیر ختم کرنا چاہیے اور پھر اِس کے بعد تفسیر اور وہ بھی تفسیرِ جلالین (بقدر درس) پڑھائی جائے۔ (جو نہایت مختصر ہے اور جس کے الفاظ قرآن کے الفاظ جتنے ہیں۔) وہ لکھتے ہیں: ''قرآنِ عظیم اِس طرح پڑھائیں کہ صرف قرآن اور ترجمہ بغیر تفسیر کے (پڑھا جائے) مگر جہاں شانِ نزول یا قاعدہ نحو مشکل ہو وہاں ٹھہر جائیں اور بحث کریں' بعد اِس کے تفسیرِ جلالین بقدرِ درس پڑھا دیں۔'' (ترجمہ)

(ماخوذ از: ''دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر'')

☆ — ☆ — ☆

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

© rasailojaraid.com